اقبال

اجمالی تبصرہ

بعد نظر ثانی

مجنوں گورکھپوری

آزاد کتاب گھر۔ کلاں محل۔ دہلی

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

تعداد ایک ہزار

بار دوم

اکتوبر ۵۵ء

یونین پرنٹنگ پریس دہلی

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

صاحبِ ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے

گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش

اقبال

انتساب

اپنے نئے اور پرانے

طلبا کے نام

(۱)

دنیا میں کبھی کبھی ایسی ہستیاں بھی پیدا ہوتی ہیں جو نہ صرف اپنے زمانے کے میلانات کے تابع ہوتی ہیں بلکہ خود ان پر قادر بھی ہوتی ہیں اور ان کا رخ نئی سمتوں میں موڑ سکتی ہیں۔ اقبال کا شمار بھی ایسی ہی ہستیوں میں ہوگا۔ وہ یقیناً ایک ایسے صاحب بصیرت اور ایک ایسے دانائے راز تھے جس کی جگہ اردو شاعری میں ابھی کچھ عرصہ تک کوئی لیتا نظر نہیں آتا۔ وہ بیک وقت اپنے زمانے کی مخلوق بھی تھے اور ایک نئے زمانے کے پروردگار بھی۔ اگرچہ آخر میں وہ خود اپنے شکار ہو کر رہ گئے۔

اقبال کی شاعری اور ان کی فکر و بصیرت کا ہندوستانی دور معاشرت کی اس اہم تاریخی تحریک سے ملتا ہے جو تحریک سرسید کے نام سے مشہور ہے۔ اور جو غدر کی تباہیوں کے بعد ایک اصلاحی تحریک تھی۔ سرسید کا اصل مقصد تو اپنی قوم کو

پستی اور غفلت کے بدبودار گڈھے سے نکال کر بیداری اور ترقی کے میدان میں دوسری ہمعصر جماعتوں کے دوش بدوش لے آنا تھا۔ لیکن اس کا ضمنی مگر لازمی اور نہایت اہم اثر اردو شعروادب پر بھی پڑا جس نے حالی اور آزاد جیسی جید اور گراں قدر شخصیتیں پیدا کیں۔ اردو نظم و نثر میں حالی اور آزاد نے جو نئی لے چھیڑی تھی اقبال نے اس کی تکمیل کی۔ ہم اقبال کو مدرسۂ حالی کا مکمل اور تربیت یافتہ نمونہ کہہ سکتے ہیں۔ حالی اور آزاد کے بعد اردو شاعری کا میدان کچھ خالی اور بے رونق سا ہو گیا تھا۔ اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اب کوئی ایسا نہیں جو ان بزرگوں کی پیدا کی ہوئی نئی روایت کو فروغ دے۔ یا کم سے کم اس کو برقرار رکھے حالی اور اقبال کے درمیان جو خلا ہے وہ ایسی ہے جو محسوس ہوتی ہے۔ اور ہم کو افسردہ کر دیتی ہے۔ لیکن پھر جب اقبال کی آواز کان میں پڑتی ہے تو نئی امیدیں بندھ جاتی ہیں۔ اور یہ سوچ کر اطمینان ہونے لگتا ہے کہ شاید "دیر آید درست آید" کی مثل غلط نہیں ہے۔ اگر اقبال نہ ہوتے تو نہیں کہا جا سکتا کہ اردو شاعری میں جس نئی عمارت کی بنیاد حالی اور آزاد ڈال گئے تھے اس کو بلندی کی اس منزل تک پہنچنے میں ابھی کتنی دیر لگتی۔

اقبال کی شاعری میں ہم کو بہت سی کمیاں اور ایک سے زیادہ غلط اور مایوس کن موڑ نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کو عہد آفریں شاعر ماننے میں شاید ہی کسی کو تامل ہو۔ ان کی شاعری اردو ادب کی تاریخ میں ایک ایسا نیا میلان ہے جو نہ صرف اپنے ملک۔ اپنی مخصوص جماعت اور اپنی زبان کے لئے اہم ہے۔ بلکہ ایک حد تک آفاقی حیثیت اور عالمگیر قدر بھی رکھتی ہے

اقبال کی شاعری میں جو غلط اندیشیاں ہیں ان کو تسلیم کرنے کے بعد بھی ان کے وہاں ایسے عناصر کی کمی نہیں جو ملک اور فرقہ کے محدود دائرے سے باہر عام دنیائے انسانیت کے لئے انقلاب اور ترقی کے صحیح محرکات بن سکتے ہیں اور جو ہر زمانہ اور ہر ملک میں قبول کئے جا سکتے ہیں۔

(۲)

یوں تو اردو شاعری میں افادیت، ترغیب عمل اور ترقی پسندی کی تحریک سرسید کے زیر اثر حالی سے ہوتی ہے۔ لیکن حالی زمانہ شناس اور مصلحت اندیش جس قدر بھی رہے ہوں وہ کوئی مفکر نہ تھے۔ اور ان کے اندر ایسی بصیرت نہ تھی جو دور تک مستقبل کا احاطہ کر سکتی۔ اسی لئے ان کی شاعری میں کوئی مستقل تعمیری پیغام نہیں ملتا۔ وہ زیادہ سے زیادہ "مسدس" کے شاعر ہو سکتے تھے جو وہ ہوئے۔ یعنی ان کی شاعری ہم کو محض ہماری گزری ہوئی عظمتوں کو یاد دلا کر ہمارے اندر حرکت اور بیداری کی علامتیں پیدا کرنے میں تو کامیاب رہی مگر انقلاب اور ترقی کا کوئی واضح اور قطعی تصور پیدا نہ کر سکی۔

اقبال اردو کا پہلا شاعر ہے جو مفکر بھی ہے اور صاحب پیغام بھی۔ اردو شاعری میں فکر و تامل کے میلان کی ابتدا غالب سے ہوتی ہے۔ لیکن غالب غزل گو شاعر تھے اس لئے اگر ان کا کوئی مدلل اور منضبط فلسفہ رہا بھی ہو تو وہ اس کو ربط اور تسلسل کے ساتھ پیش نہ کر سکتے تھے۔ ان کی غزلوں کے اشعار میں جا بجا ان کا مفکرانہ انداز ظاہر ہوتا رہتا ہے اور ہم کو نئے نئے فکر انگیز اشارے ملتے رہتے

ہیں، مگر بس! ان کو خود احساس تھا کہ تنگنائے غزل کی محدود وسعت ان کے حوصلۂ فکر کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔ اردو شاعری میں اقبال پہلی ہستی ہیں جن کو صحیح معنی میں مفکر کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ان کی شاعری کی بنیاد ایک خاص نظامِ فکر یعنی IDEOLOGY پر ہے۔ ان کے خیالات میں ترتیب و تسلسل اور استدلال و نتیجہ نظر آتا ہے۔ اور ان کے اسلوب میں بھی ایک ربط اور ضابطہ ہوتا ہے۔

دنیا میں ایسے شاعروں کی کمی نہیں رہی ہے جنھوں نے انسان کی زندگی اور اس کے مقدر پر گہری اور پُر تامل نظر ڈالی ہو اور سوچ سمجھ کر کسی خاص نتیجہ پر پہنچے ہوں۔ انسان کی مجبوریاں اور ناکامیاں اس کو ایک اٹل اور ناقابلِ شکست تقدیر کا احساس اکثر دلاتی رہی ہیں۔ عمر خیام کی شاعری کا سنگِ بنیاد یہی احساس ہے۔ وہ تقدیر کو ایک اندھی اور شریر قوت سمجھتا ہے اور اکثر ایک باغیانہ انداز میں اس کے ساتھ ٹھٹھا کرتا ہے۔ یہ گویا جواب ہے تقدیرِ انسانی کی سنگینی اور سنگ دلی کا۔ وہ زندگی کو ناقابلِ اعتبار سمجھتا ہے اور قضا و قدر کو ایک بے درد قوت مانتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ہم کو یہ بھی ترغیب دیتا ہے کہ جب کل مرنا قطعی اور یقینی ہے تو پھر آج سے ہم جس قدر بھی لذتیں حاصل کر سکتے ہیں کیوں نہ حاصل کر لیں۔ ماضی کا غم اور مستقبل کا اندیشہ دونوں بے سود ہیں۔ جو کچھ ہے وہ لمحۂ حال ہے، اور اسی سے ہم کو کثیر کثیر لذت اور زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا ہے۔ حافظ کا تصوف بھی کچھ اسی قسم کی چیز ہے۔ وہ عمر خیام کی طرح قضا و قدر کے ساتھ تمسخر تو نہیں کرتے اور نہ محض شراب

شاہد میں زندگی کے تمام فسادات کو بھولے رہنے کی تعلیم دیتے ہیں لیکن حقیقت اور معرفت کے دائرے میں پناہ لے کر جس ترک اور بے نیازی کی ترغیب دیتے ہیں وہ ایک طرح کی نیستی اور مجہولیت ہے جو جوگ اور تیاگ سے کچھ ہی مختلف ہے۔ ٹامس ہارڈی (THOMAS HARDY) کی قنوطیت بھی اسی عنوان کی چیز ہے۔ جو مسئلہ جبر و اختیار کا دوسرا حل ہے۔ غالب کا فلسفیانہ طنز بھی ہم کو زندگی کی تلخیوں کا ایک مبہم احساس دلاتا ہے۔ ان سب بڑی شخصیتوں نے زندگی اور اس کے مسئلوں پر کچھ نہ کچھ سوچا ہے اور اپنی اپنی رسائی اور اپنی اپنی توفیق کے مطابق کسی نہ کسی نتیجے پر پہنچے ہیں۔ مگر ان میں ایک بھی ایسا نہیں جس نے ہم کو کوئی سنجیدہ اور عملی پیغام دیا ہو۔ اور یہ بتایا ہو کہ ہماری تقدیر تو خیر جو ہے سو ہے۔ اب ہم کیا کریں۔

(اقبال ان لوگوں میں نہیں، جو سوچ سوچ کر رہ جائیں۔ یا سمجھ سمجھ کر پچھتائیں۔ اور نہ وہ زندگی کے آلام اور صعوبات سے بچنے کے لئے کوئی سستی قسم کا نسخہ بتلاتے۔ ان کی نگاہیں زندگی پر گہری پڑتی ہیں اور وہ نہایت واضح اور حقیقی نتائج پر پہنچے ہیں۔ جن کو انھوں نے باضابطہ مرتب کر کے ایک مستقل پیغام کی صورت میں ہم کو دیا ہے)

اقبال کو زندگی کی پیچیدگیوں اور اس کے فطری تناقضات کا صحیح احساس تھا۔ انسانی دنیا کی تاریخی رفتار کا انھوں نے غور و فکر کے ساتھ مطالعہ کیا تھا۔ وہ فطرتاً فکر و تامل کی طرف مائل تھے۔ اور حکیمانہ نگاہ لے کر پیدا ہوئے تھے۔ ان کو یہ سمجھنے میں زحمت نہیں ہوئی کہ زندگی ایک متحرک

اور ترقی پذیر حقیقت ہے۔ اور تغیر و انقلاب اس کے لازمی اور صحیح عناصر ہیں۔ "پیامِ مشرق" میں انہوں نے اکثر نہایت صاف اور واضح الفاظ میں اس راز کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً:-

سراپا معنیٔ سربستہ ام من
نگاہِ حرف بافاں بر نتابم
نہ مختارم تواں گفتن نہ مجبور
کہ خاکِ زندہ ام در انقلابم

جس مفکر یا صنّاع نے زندگی کی حقیقت کو اس قدر صحیح طور پر ہمارے سامنے پیش کیا ہو اس سے شاید ہی ترقی کا کوئی دور منکر ہو سکے۔

(۳)

اقبال کو جو زمانہ میسر ہوا وہ ملک و قوم کی زندگی کے ہر شعبہ میں انتشار و پراگندگی کا زمانہ تھا۔ ہمارے قومی رہنماؤں نے ہمارے اندر نیا شعور پیدا کر دیا تھا۔ ہم اپنی غفلتوں سے چونک چکے تھے۔ سماج اور معاشرت کی پرانی قدریں اور روایتی مفروضات غلط یا بے کار ثابت ہو چکے تھے۔ اور ابھی کسی نئے نظام اور نئی ہیئت کا واضح اور قطعی تصور پیدا نہیں ہوا تھا۔ شعر و ادب کے شعبہ میں بھی نئی قدروں، نئے تصورات اور نئے اسالیب کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اردو شاعر جس کی اصل کائنات غزل اور ضمنی اکتسابات قصائد، مثنویات اور مراثی تھے۔ اپنے تمام امکانات کو بروئے کار لا کر بظاہر اپنے

مقدر کی تکمیل کر چکی تھی۔ اور اب اس میں کوئی جان نہ تھی۔ حالی اور آزاد نے پرانی روش کو چھوڑ کر شاعری میں جو نئی راہ پیدا کی تھی اس نے نئے امکانات کا شعور تو ہمارے اندر پیدا کر دیا تھا لیکن ابھی ہماری سمجھ میں اچھی طرح نہیں آیا تھا کہ میرو مصحفی کی پیروی کو اگر ہم چھوڑیں اور امیر و داغ کے رائج کئے ہوئے معیار سے اگر انحراف کریں تو اردو شاعری کا نیا انداز کیا ہونا چاہیئے۔ اب تک اردو شاعری سے ہم کو جو کچھ ملا تھا وہ یا تو حزن و یاس تھا یا ادنیٰ اور سطحی لذت پرستی اور خوش باشی، ہماری شاعری کا بیشتر حصہ ہمارے لیئے یا تو تفریح تھا یا ماتم۔ اردو شاعری نے زندگی کی کائناتی اور اجتماعی حقیقتوں پر بہت کم دھیان دیا تھا۔ اور اس کو زندگی سے بہت کم واسطہ تھا۔ اجتماعی یا جمہوری زندگی کا احساس تو اس میں سرے سے مفقود تھا۔ اقبال اور چکبست، حالی۔ اور آزاد کے بعد پہلے شاعر ہیں جنہوں نے ہماری شاعری میں آفاقی اور اجتماعی زندگی کا شعور پیدا کر کے نئی وسعتیں اور نئے امکانات پیدا کیئے۔

(اقبال شاعری اور دوسرے فنونِ لطیفہ کو زندگی کی بشارت سمجھتے ہیں۔) اگر شاعر زندگی کا پیغام نہیں دیتا۔ اگر اس کے منہ سے نکلی ہوئی باتیں ہمارے دلوں میں ولولۂ حیات اور نشاطِ کار نہیں پیدا کرتیں۔ اگر اس کے "اندیشہ ہائے افلاکی" زمین کے ہنگاموں کو ہم پر سہل نہیں کرتے تو اقبال کے معیار سے وہ شاعر نہیں ہے، شاعر کو زندگی کا رہنما ہونا چاہیئے۔ اقبال ایک جگہ ہنروران ہند کی مذمت میں کہتے ہیں:-

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا
ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار

ایک دوسری جگہ کہتے ہیں:-

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

ایک اور جگہ اس سے بھی زیادہ شدید اور پُر اعتماد الفاظ میں اپنی شاعری کے نئے تصور کو یوں پیش کرتے ہیں:-

گر ہنر میں نہیں تعمیرِ خودی کا جوہر
وائے صورت گری و شاعری و ناؤ سرود

مکتب و میکدہ جز درسِ نبودن ندہند
بودن آموز کہ ہم باشی و ہم خواہی بود

یہ اُردو شاعری میں ایک بالکل نئی آواز ہے۔ جو ہمارے اندر بیک وقت یہ احساس پیدا کرتی ہے کہ ہماری شاعری کیا رہی اور کیا نہیں رہی اور اس کو کیا ہونا چاہیئے۔ اور کیا ہو سکتی ہے۔ اقبال نے جس طرح ہمارے سوئے ہوئے شعور کو جگایا ہے اُردو کا کوئی دوسرا شاعر نہیں جگا سکا تھا۔ اُن کو اگر یہ احساس ہے تو غلط نہیں:

جو کو کنار کے خوگر تھے اُن غریبوں کو
تری نوا نے دیا ذوقِ جذبہ ہائے بلند

اقبال نے شاعری سے ہمارے اندر ذوقِ سعی و عمل پیدا کیا۔ اور ہمارے ذہنی میلانات کو ترقی کی نئی سمتوں میں لگایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو شاعری

کی دنیا کچھ ہی سالوں کے اندر کچھ سے کچھ نظر آنے لگی۔ اقبال کا یہ شعر محض شاعرانہ تعلّی نہیں ہے بلکہ ایک تاریخی واقعہ ہے :-

پس از من شعرِ من خوانند و دریابند و می گویند
جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

کم سے کم ہماری شاعری کی دنیا کو تو اقبال نے بدل ہی دیا۔

(۴)

اقبال کی تعلیم بچپن سے ایسی ہوئی تھی کہ ان کو فارسی زبان و ادب بالخصوص فارسی شاعری کے ساتھ خاص شغف پیدا ہو گیا تھا۔ فارسی شاعری کے لطیف اور بلیغ ترنم اور آہنگ نے ان کو بے حد متاثر کیا۔ غزل گو فارسی شعراء میں سعدی۔ حافظ۔ نظیری اور بیدل اور صوفی شعراء میں سنائی عطار اور رومی اُن کے دل و دماغ پر اوائل عمر ہی سے چھائے ہوئے تھے۔ ابن عربی اور ابو العلا معرّی کے مطالعہ نے بھی ان پر کچھ کم اثر نہیں ڈالا ہے لیکن ان اثرات میں سب سے زیادہ راسخ اور قوی اثر مولانا جلال الدین رومی کا ہے۔ جن کا حوالہ اقبال کے کلام میں بار بار ملتا ہے۔ اقبال کو رومی کے ساتھ جو ارادت ہے وہ کورانہ تقلید کی حد تک بڑھی ہوئی ہے۔ جس سے ان کی پیغمبرانہ حیثیت کو نقصان بھی پہنچا۔ اپنے تمام فلسفۂ حرکت و انقلاب اور اپنے تمام پیغامِ سعی و عمل کے باوجود اقبال اس ماورائیت (TRANSENDENTALISM) کے دام میں اُلجھ اُلجھ کے رہ جاتے

ہیں جس کو اگر ایک طرف رومی اور عطار کے مطالعہ کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے تو دوسری طرف جرمنی کے فلسفۂ تصوریت سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔

مغربی ادب کے مطالعہ نے اقبال کی فکر و بصیرت کی تربیت میں کچھ کم حصہ نہیں لیا۔ اور چونکہ اخذ اور جذب کی قوت ان میں خداداد تھی اس لئے انہوں نے مشرقی ادب اور مغربی ادب دونوں کے اثرات کو اپنی شاعری میں اس طرح سمو لیا کہ دونوں مل کر ایک مہذب اور خوشگوار آہنگ بن گئے۔ مشرقی خیالات اور مغربی افکار کی ایسی صحیح آمیزش اردو کیا ٹیگور کو چھوڑ کر دوسری کسی زبان کے کسی شاعر کے کلام میں نہیں ملتی۔

مغرب کے جن مفکروں اور جن ادیبوں نے اقبال کے ذہن پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں ان میں گوئٹے۔ نٹشے، ہیگل اور برگساں اور شعراء میں ورڈزورتھ، گوئٹے۔ ہائینا، براؤننگ اور ایمرسن کے اثرات ان کی شاعری میں مستقلاً نمایاں نظر آتے ہیں۔ مگر مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کی شاعری کے خمیر میں جو عناصر سب سے زیادہ غالب ہیں وہ رومی کا تصوف اور مغربی حکما کا فلسفۂ تصوریت (IDEALISM) ہے۔ خصوصیت کے ساتھ جرمن تصوریت کے وہ مدرسے جو ارادیت (VOLUNTARISM) اور عملیت (ACTIVISM) کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ اقبال کے تمام افکار میں جاری و ساری نظر آتے ہیں۔

۵

اقبال کی شخصیت جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے اردو شاعری کی تواریخ میں ایک پیغمبرانہ شان رکھتی ہے اور گرامی کا یہ کہنا کہ

در دیدۂ معنی نگہاں حضرت اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

محض بڑھی ہوئی عقیدت نہیں ہے۔ اقبال کا پیغام تسلسل اور استقلال کے ساتھ ایک ہے جس کو مجملاً ہم پیغامِ عمل یا عملیت کہہ سکتے ہیں۔ یہ پیغام اگرچہ مشرقی متصوفین اور مغربی حکماء کے آثار لئے ہوئے ہے۔ مگر مجموعی حیثیت سے اقبال کا اپنا انفرادی اکتساب ہے۔ اُن کے فلسفۂ زندگی کی ابتدا "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بیخودی" سے ہوتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ کائنات کے ذرّہ ذرّہ میں ایک انفرادی روح ہوتی ہے۔ جس کو خودی کہتے ہیں۔ اور جو انسان میں ایک خاص درجۂ تکمیل کو پہنچ گئی ہے۔ یہ خودی ایک متحرک اور مائل بہ ارتقا قوت ہے جو اپنے کو بہتر سے بہتر صورت میں ظاہر کرنے کے لئے بیتاب رہتی ہے۔

؎ وا نمودن خویش را خوئے خودیست
خفتہ در ہر ذرّہ نیروئے خودیست

اور خودی کا اوّلین عنصر آرزو ہے ؎

آرزو ہنگامہ آرائے خودیست
موجِ بیتابے ز دریائے خودیست

اقبال کا یہ فلسفہ خودی جرمنی کے مشہور ماہر ریاضیات فلسفی لائبنز (LEIBNITZ) کے نظریۂ فردیات (THEORY OF MONADS) سے اگر براہِ راست ماخوذ نہیں ہے تو اس سے بہت کچھ ملتا جلتا ضرور ہے۔ لائبنز کا خیال ہے کہ ہر ذی حیات اور غیر ذی حیات شے میں اس کی ایک فردیت ہوتی ہے۔ یہ فردیت انسان میں پہنچکر مکمل ہو جاتی ہے۔ اقبال کا بھی عقیدہ یہی ہے کہ انسان میں پہنچکر خودی خاطر خواہ تکمیل پاتی ہے اور انسان کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی خودی یا شخصیت کی تہذیب و تکمیل میں اپنی ساری قوتیں صرف کر دے۔ کیونکہ آگے چل کر تمام بنی نوع انسان کی زندگی کی بقا اور ترقی اسی پر منحصر ہے۔ یہ ہیں اقبال کے اسرارِ خودی۔

اکثر نقادوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر "رموزِ بیخودی" کیا ہیں؟ خودی کی تبلیغ کر چکنے کے بعد یہ بیخودی کا نعرہ کیسا؟ بات یہ ہے کہ اقبال زندگی کی جدلیات یعنی (DIALECTICS) کو اچھی طرح سمجھے ہوئے تھے۔ اور وہ جانتے تھے کہ زندگی میں اضداد نہ صرف اکٹھا ہیں بلکہ انھیں کی ترکیب اور ہم آہنگی کا نام زندگی ہے۔ اقبال تغیر اور انقلاب کے قائل تھے۔ اور اس کو لبیک کہتے تھے۔ وہ اس راز سے واقف تھے کہ ہر چیز کا بدلنا اور اپنی تردید آپ کرنا زندگی کی اصل فطرت ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو کائنات اور انسان کی زندگی کی ارتقائی رفتار کب کی رُک گئی ہوتی۔ اس نظریہ کی روشنی میں نہ صرف خودی اور بیخودی کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے بلکہ زندگی کا سب سے پیچیدہ اور اہم عقدہ یعنی مسئلہ جبر و اختیار بھی سمجھ میں آجاتا ہے۔

انسان کی انفرادی شخصیت کی تہذیب و ترقی اس لیے ضروری ہے کہ بالآخر اسی سے تمام جماعت انسانی کی فلاح ہو سکتی ہے جب انسان اپنی انفرادی شخصیت کو مکمل کر چکتا ہے تو پھر دوسرا فرض جو اقبال کا فلسفہ اس پر عائد کرتا ہے، یہ ہے کہ اس تربیت یافتہ شخصیت کو جماعت کا تابع اور تمام دنیائے انسانیت کی ترقی اور بہبود کا ایک عنصر بنایا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے گا تو افراد کی خودی بہت جلد منتشر اور پراگندہ ہو کر فنا ہو جائے گی یعنی خود فرد کی زندگی اور اس کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ وہ جماعت کی ترقی کو اپنا نصب العین بنائے۔ قدماء کی اصطلاحوں میں ہم اس کو یوں کہہ سکتے ہیں کہ کل کی ترقی سے جزو کی ترقی جاری رہتی ہے۔ مگر جب تک کہ پہلے ایک ایک جزو صحیح اور توانا نہ ہو لے کل بحیثیت کل کے ترقی بھی نہیں کر سکتا ہے۔ اب اس نکتہ کو اقبال کی زبان میں سنئے :-

فرد تا اندر جماعت گم شود
قطرہ وسعت طلب قلزم شود
فطرتش دارد فقہ یکتائی است
حفظ او از انجمن آرائی است

یہیں سے آزادی اور مجبوری کا سوال بھی حل ہو جاتا ہے۔ اقبال آزادی اور پابندی کو باہم مشروط اور لازم و ملزوم سمجھتے ہیں چنانچہ رموز بیخودی میں کہتے ہیں

در اطاعت کوش اے غفلت شعار
می شود از جبر پیدا اختیار

اسی تصور کو اس سے زیادہ انسانی لب و لہجہ اور زیادہ دل نشین اور قابل قبول انداز میں دوسری جگہ یوں پیش کرتے ہیں :-

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بگل بھی ہے
انھیں پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے

یہ خیالات اس قدر جدید اور ترقی یافتہ ہیں کہ شاید ہی کوئی مفکران پر اضافہ کر سکے۔ مارکس وغیرہ بھی آزادی کی اس سے بہتر تعریف نہ کر سکے کہ آزادی نام ہے مجبوری کے شعور کا۔ انسان اور دیگر مخلوقات میں ایک بہت بڑا فرق یہ بھی ہے کہ دوسری مخلوقات کو اپنی مجبوریوں اور بیچارگیوں کا احساس نہیں ہوتا اور انسان کو نہ صرف اپنی مجبوریوں کا احساس ہوتا ہے بلکہ وہ اپنی کوششوں سے ان کا تدارک اور ان کی تلافی بھی کرتا رہتا ہے اور جہاں مناسب ہوتا ہے اپنی آزادی اور مجبوری دونوں کو ملا کر ایک مرکب آہنگ بنا لیتا ہے یعنی وہ جبر سے اختیار پیدا کرتا ہے۔

(۶)

اقبال نے اپنے پیغام کے لیے چند اصطلاحیں مخصوص کر لی ہیں جو ہر مفکر کرتا ہے، یہ اصطلاحیں اردو لغت میں نئی نہیں ہیں لیکن اقبال نے ان کو بدل کر اپنے فلسفہ کا ایک لازمی اور مستقل جزو بنا لیا ہے۔ اور اس طرح وہ ہمارے لئے نئے الفاظ نہ سہی نئے تصورات ضرور ہیں۔ خودی اور بیخودی سے بحث ہو چکی ہے۔ اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ اقبال نے خودی

اور بیخودی کو فلسفیانہ اصطلاحیں بنا کر انھیں پر اپنے نظامِ فکر کی بنیاد رکھی ہے۔ اسی طرح اقبال نے عشق کا تصور بھی از سرِ نو پیدا کیا ہے۔ اردو شاعری میں عشق کا لفظ ایک فرسودہ سی چیز ہے۔ خاص کر غزل کا پہلا سنگِ بنیاد عشق ہی ہے۔ لیکن اقبال کے یہاں عشق کسی ذاتی جذبے کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک کائناتی چیز ہے۔ جس طرح برگساں "قوتِ حیاتیہ" یا (LIFE FORCE) کو اور جرمنی کا مشہور حکیم روڈولف آئکن ایک آزاد روحانی حرکت کو عالمگیر حقیقتِ اولیٰ مانتا ہے اسی طرح اقبال عشق کو ایک ایسی ازلی قوت تسلیم کرتے ہیں جو تمام تخلیق اور ارتقا کی ذمہ دار ہے زندگی کی بنیادی حقیقت تو اقبال کے خیال میں خودی ہے۔ لیکن مکمل خودی کی لازمی علامت اور اس کی ترقیوں کی ضامن جو چیز ہے وہ عشق ہے۔ اقبال کا تصورِ عشق جنسی اور روحی تحریک کے عنصر سے بالکل معرّیٰ ہو گیا ہے۔ اور محض ایک ماورائی قوت ہو کر رہ گیا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ عشق کا یہ تصور عام انسانی سطح سے بہت دور ہو گیا ہے۔ اور اس میں انسانیت کی بو بہت کم باقی رہ گئی ہے۔ ہم اپنے کو اس سے کچھ اجنبی سا پاتے ہیں۔ یہ خیال ایک حد تک صحیح ہوگا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اقبال نے اپنے فلسفہ کے لئے ایک ایسی اصطلاح کیوں منتخب کی جو اس سے پہلے عوام کے لئے اس قدر مانوس ہو چکی تھی۔ اور جس کو ہر کس و ناکس اپنی زندگی کا ایک عام اور لازمی جزو سمجھتا تھا۔ شاید ایران و عرب اور ہندوستان کے اسلامی متصوفین کے مطالعہ کا یہ اثر ہو کہ اقبال کو عشق

کے سوا کوئی دوسرا لفظ نہیں ملا جس سے وہ اپنا مطلب ادا کر سکتے۔ مگر دوسرے پہلو سے اگر دیکھا جائے تو ہم کو ماننا پڑے گا کہ اقبال نے عشق کے تصور کو نہ صرف بلند کیا ہے بلکہ اس کو ایک ہمہ گیر اور کلی تخلیقی قوت بنا کر پیش کیا ہے۔ عشق وہ جوہر ہے جو ازل سے موجود ہے اور کائنات کے ذرّہ ذرّہ میں حرکت کر رہا ہے۔ اور جس کی انتہائی امکانی تکمیل انسان کے ذریعہ ہوئی۔

جس حرکتِ دوام کو ہیگل نے جدلیاتی قوت بتایا تھا جس کو برگسان مسلسل بہاؤ یا استمرار کہتا ہے اس کو اقبال کی لغت میں عشق کہتے ہیں۔ عشق ہی زندگی کے تمام حدوث و انقلاب اور تہذیب و ترقی کا اصل راز ہے۔ عشق انسانیت کو کبھی ایک منزلِ سکون پر قناعت کر کے بیٹھ رہنے کی اجازت نہیں دیتا۔ گویا عشق نام ہے فطرتِ ناصبور کا جو منزل بمنزل گذرتا چلا جاتا ہے لیکن کسی منزل پر قرار نہیں لیتا۔

عیشِ منزل ہے غریبانِ محبت پہ حرام
سب مسافر ہیں بظاہر نظر آتے ہیں مقیم

ایک دوسری جگہ کہتے ہیں:-

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

عشق زندگی کی روحِ رواں ہے۔ اگر عشق نہ ہوتا تو یا تو زندگی کب کی فنا ہو گئی ہوتی۔ یا اگر اس کا وجود باقی ہوتا تو اس میں اتنی کیفیتیں

اتنے تنوعات اور ترقی کے اتنے امکانات نہ پیدا ہوتے۔ اقبال اس خیال کو یوں پیش کرتے ہیں:-

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوزِ دمبدم
آدمی کے ریشہ ریشہ میں سما جاتا ہے عشق
شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم

فطرت اور کائنات اور حیاتِ انسانی کی انفرادی اور اجتماعی دنیاؤں میں جو کچھ ہوتا رہا ہے اور جو کچھ ہوتا رہے گا وہ اسی قوت کی نمائش ہے جس کا نام اقبال نے عشق رکھا ہے:-

کبھی آوارہ و بے خانماں عشق
کبھی شاہِ شہاں نوشیرواں عشق
کبھی میداں میں آتا ہے زرہ پوش
کبھی عریاں و بے تیغ و سناں عشق

عشق انسان کی انانیت اور نفسانیت کو مٹا کر اس کے اندر ازل سے لے کر ابد تک تمام کائنات و امکانات کی سمائی پیدا کر دیتا ہے۔ یہ بہت پرانا خیال ہے۔ مگر اقبال نے اس کو ایسے نئے لہجہ کے ساتھ پیش کیا ہے کہ ہم کو ایک بالکل نیا تصور معلوم ہوتا ہے۔ اس سے پہلے اس قسم کے خیالات تصوف اور معرفت کے دائرے تک محدود تھے اور سوچنے سمجھنے والوں کے لیے مجہولیت کے خیالات تھے۔ لیکن اقبال نے انھیں

خیالات کو مجہولیت اور بیتی سے نکال کر ان میں زندگی کی لہریں بھر دیں۔ اور ان کو اپنے فلسفۂ سعی و عمل کے ترکیبی عناصر بنائے۔ ان کی تعلیم یہ ہے کہ عشق انسان کو انسانِ اعلیٰ بنا سکتا ہے بشرطیکہ اس کی بڑھی ہوئی انانیت اس کے راستہ میں حائل نہ ہو اور اس کی نگاہ کو تنگ اور خیرہ نہ کر دے۔

بنایا عشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھ کو
یہ میری خود نگہ داری مرا ساحل نہ بن جائے

انسان کی عملی زندگی میں اس عشق کا بہترین مظاہرہ آزادی ہے۔ اقبال آزادی کے قائل تھے۔ اور اس کو انسان کی زندگی کی فلاح اور ترقی کے لئے لازمی سمجھتے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ جہاں آزادی نہیں وہاں زندگی کی قوت پنپ نہیں سکتی۔ اور عشق و محبت جیسا کہ بتایا جا چکا ہے زندگی کی قوت ہی کے دوسرے نام ہیں۔ محبت کسی قسم کی مجبوری یا جکڑبندی کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ ایک چھوٹی بحر کی مسلسل غزل یا غزل نما نظم میں اقبال نے اپنے اس خیال کو بڑی پختگی اور شائستگی کے ساتھ پیش کیا ہے

شہید محبت نہ کافر نہ غازی
محبت کی رسمیں نہ ترکی نہ تازی
وہ کچھ اور شے ہے محبت نہیں ہے
سکھائی ہے جو غزنوی کو ایازی
یہ جوہر اگر کارفرما نہیں ہے
تو ہیں علم و حکمت فقط شیشہ بازی

نہ محتاجِ سلطاں نہ مرعوبِ سلطاں
محبت ہے آزادی و بے نیازی

ہم یہ سوچ کر مضمحل سے ہو جاتے ہیں کہ جو شخص محبت اور آزادی کا اتنا بلند آفاقی تصور رکھتا ہو اور جو عشق کو انسانیت کی پہلی شرط مانتا ہو۔ جو شخص ایمان و اعتقاد کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہو کہ :-

اگر ہے عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
وگرنہ مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

وہ پھر کفر و اسلام ، ایران و عرب ، حجاز و غیر حجاز کے تفرقوں کو کیسے گوارا کر سکتا ہے۔ ہم کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال جس تصور کو بھی لے کر اٹھتے ہیں وہ اول اول نہایت بلند اور وسیع اور تمام دنیائے انسانیت پر محیط ہوتا ہے۔ لیکن بہت جلد اس وسعت اور بلندی سے وہ اس قدر سراسیمہ ہو جاتے ہیں کہ اپنی فکر و نظر کا دائرہ گھٹا کر نہایت تنگ اور اپنے سعی و عمل کی سطح کو بہت پست کر دیتے ہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ جس عشق کو انسان کا خمیر بتایا گیا ہے وہ محض کسی مرد مومن کا اجارہ کیونکر ہو سکتا ہے اور جو عشق ایک کائناتی حقیقت ہے اس کو پھر حجازیت یا کسی دوسرے عنوان کے قومی یا ملی پیغام کا سنگِ بنیاد بنانا کہاں کی دانائی ہے۔

۷

اقبال کا کلام اور ان کا پیغام ایک صحیح اور صالح فکری صلاحیت رکھنے والے ذہن کو الجھن میں ڈال دیتا ہے اور وہ قطعی فیصلہ نہیں کر سکتا کہ اقبال کو ترقی پسند کہا جائے یا قدامت پرست، کبھی کبھی واقعی ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کا مسلک انسانیت اور آفاقیت تھا یا ستے قسم کی ملیت اور اسلاف پرستی اس لئے کہ دونوں عنوان کے عناصر اقبال کے ہاں مخلوط اور گڈمڈ ملتے ہیں۔ جس سے ہم کو اکثر یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ خود اقبال کے لئے ان کے افکار و خیالات صاف اور سلجھے ہوئے نہیں تھے۔ اقبال کی شخصیت اور ان کی شاعری دونوں ایسے تناقضات کی حامل ہیں جو کسی طرح شیر و شکر نہیں ہو سکتے۔ لیکن اگر ہم تحمل، رواداری اور فراخ دلی سے کام لیں تو ان تناقضات کو سمجھنا کچھ زیادہ دشوار نہیں ہے۔ اقبال یقیناً انقلاب اور ترقی کے جدید ترین تصورات کو لے کر اٹھے تھے۔ وہ سمجھتے تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ یہ عالم موجودات حرکت و انقلاب کے لئے مجبور ہے۔ اور کبھی کسی ایک منزل پر ٹھہر کر قناعت نہیں کر سکتا۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

انسان کو کسی ایک مقام پر مطمئن اور قانع اور زندگی سے ہمیشہ کے

لئے آسودہ ہو کر بیٹھ نہیں رہنا چاہیئے۔ اس لئے کہ اس سے زندگی میں فساد اور تعفن پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ تعلیم اقبال ایک جگہ ان الفاظ میں دیتے ہیں:۔

ز جوئے کہکشاں بگذر ز نیل آسماں بگذر
بہ منزل دل بمیر دگر چہ باشد منزل ما ہے

ایک دوسرے شعر میں کہتے ہیں:۔

دلِ عاشقاں بمیرد بہ بہشتِ جاودانی
نہ نوائے دردمندے نہ غمِ گسارے

یہ آواز کسی ایسے شخص کی نہیں ہو سکتی جس کا مسلک رجعت ہو۔ پھر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اقبال ہندوستان کا نہ صرف پہلا شاعر بلکہ پہلا شخص ہے جس نے ہمارے اندر یہ شعور پیدا کیا کہ خدا اور قضا و قدر کے مقابلہ میں انسانیت بھی اپنا ایک خاص وزن اور وقار رکھتی ہے، اور اس دنیا کی تہذیب و تحسین میں انسانی ارادہ و کوشش نے خداوندی مشیت اور تقدیر سے کچھ کم حصہ نہیں لیا ہے تو ہم مجبور ہوتے ہیں کہ اقبال کی شاعری کو انقلاب اور ترقی کی آواز سمجھیں۔ مثال کے طور پر ان کی مشہور نظم "شکوہ" کو لیجیے۔ جو فکر و گفتار کی بیباک آزادی کا اردو شاعری میں پہلا نمونہ ہے۔ اس سے پہلے ہماری شاعری اس جرأت کلام اور اس تابِ سخن سے بالکل خالی تھی۔ ہمارے کان پہلی مرتبہ ایسی آواز سنتے ہیں جس کی سب سے بڑی خصوصیت مردانگی و ولولۂ حیات

اور پندار انسانیت ہے۔ اور جس کی ترکیب میں جذبات اور تخیل کے ساتھ ساتھ ارادہ اور ذوقِ عمل بھی داخل ہیں۔

یا ان کا مشہور محاورہ "مابین خدا و انسان" لیجیے جو انسانیت کے مرتبہ کو نہایت بے دریغ اور فیصلہ کن لہجہ میں ملکوتیت اور الوہیت دونوں سے ممتاز اور ایک اعتبار سے ان پر اضافہ قرار دیتا ہے۔ خدا نے انسان پر الزام لگایا تھا:-

جہاں را زیک آب و گِل آفریدم
تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی

من از خاک پولادِ ناب آفریدم
تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی

تیر آفریدی نہالِ چمن را
قفس ساختی طائرِ نغمہ زن را

انسان ایک خاص پندار اور احساسِ برتری کے ساتھ اس کا جواب دیتا ہے۔ جس کے جواب میں پھر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم

بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اور ایک رباعی میں تو اقبال نے "خدا و انسان" اور خدائی و بندگی کے متعلق گویا آخری حکم لگا دیا ہے۔

خدائی اہتمامِ خشک و تر ہے
خداوندا خدائی دردِ سر ہے
ولیکن بندگی استغفر اللہ
یہ دردِ سر نہیں وردِ جگر ہے

ذرا اس شعر میں بھی انسانیت کا مقام اور مرتبہ ملاحظہ ہو:-

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

اس سلسلہ میں انسانی آزادی کا یہ تصور بھی ایک بالکل نیا اکتساب ہے یہ ایک ایسا تصور ہے جس کا احاطہ کرنا ہر ادنیٰ آدمی کا کام نہیں:-

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

ایک جگہ انسان کی ارتقائی فطرت اور اس کی رفتار کو بڑے دلپذیر شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے:-

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

جو لوگ بڈھے ہو چکے ہیں اور انحطاط و رجعت کی طرف مائل ہیں ان کو ایک رباعی میں اقبال بڑی صداقت اور خلوص کے ساتھ صلاح

دیتے ہیں :-

میانِ لالہ و گل آشیاں گیر
ز مرغ نغمہ خواں دریں فغاں گیر
اگر از ناتوانی گشتہ پیر
نصیبے از شبابِ ایں جہاں گیر

خود اقبال کو اصرار ہے کہ ان کو مستقبل کا شاعر سمجھا جائے اور ان کو دعوٰی ہے کہ :-

نغمہ ام از زخمہ بے پرواستم
من نوائے شاعرِ فرداستم

اور ہم کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اقبال کا کلام ایسے اشعار سے بھرا پڑا ہے جو ساری دنیا کے لیے صحت و ترقی کا پیغام بن سکتے ہیں۔ ان کی ہر غزل اور ہر نظم میں ہم کو ایسے اشعار کافی تعداد میں مل جاتے ہیں جن میں عام حیاتِ انسانی اور اس کی جدلیاتی تاریخی رفتار کے متعلق نئے تصورات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اور جو تمام دنیا کے لیے فکر انگیز ہو سکتے ہیں۔ مثلاً

مزی اندر جہانِ کور ذوقے
کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

(وہ اس راز سے واقف تھے کہ زندگی ضدین کی آمیزش کا نام ہے اور انسانیت کے خمیر میں الوہیت اور ابلیسیت دونوں لازمی اور برابر کے اجزا ہیں۔ جبریل اور ابلیس کے مکالمہ میں ملاحظہ ہو۔ ابلیس

جبریل کو کیا جواب دیتا ہے اور کس اعتماد کے ساتھ:-

ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو
میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو!
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر
کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے میں کہ تو
خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا!
میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہُو اللہ ہُو اللہ ہُو

اقبال کو شدید احساس ہے کہ ہمارا پرانا نظامِ زندگی بیدم اور بیکار ہو چکا ہے۔ اور زندگی کی پرانی قدریں اور پرانے اسالیب اب ہمارے کام نہیں آسکتے۔ ہم کو اگر زندہ رہنا اور ترقی کی آئندہ منزلیں طے کرنا ہے تو ہم کو زندگی کا کوئی نیا نظام پیدا کرنا چاہیئے۔ اور تمدن و معاشرت اور مذہب و اخلاق کے نئے اصول بنانا چاہیئے۔ یہ نیا نظام کیسا ہو اور یہ اصول و اسالیب کیا ہوں اقبال خود کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکے اور شاید ان کے ذہن میں اس کا کوئی صحیح اور واضح تصور تھا بھی نہیں۔ لیکن ان کے اس احساس کی شدت اور اس کے

خلوص سے کسی کو انکار نہیں ہونا چاہیئے ۔ کہ دنیا بدل گئی ہے اور اس کی ضرورتیں اور اس کے مطالبات اب کچھ اور ہیں ۔ اقبال کے بعض اشعار پڑھ کر خود ہمارے اندر اس کا تیز احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ اب نئے زمانے کی نئی نفسیات شروع ہو رہی ہے اور زندگی کا رخ بالکل ایک نئی سمت میں مڑ چکا ہے ۔ جو پرانی سمتوں سے زیادہ خوش آیند ہے ۔ مثلاً "شمع و شاعر" کے بعض اشعار :-

نالۂ صیاد سے ہوں گے نوا ساماں طیور
خونِ گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی
دیکھ لینا سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل
موجِ مضطر ہی اسے زنجیرِ پا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

۵ کیفیت باقی پرانے کوہ و صحرا میں نہیں
ہے جنوں تیرا نیا پیدا نیا ویرانہ کر

یا "خضرِ راہ" کے یہ اشعار :-

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ رجعت پسندی یا اسلاف پرستی کی آواز ہے؟ یہ تو ایسے اشعار ہیں جن کو کٹر سے کٹر انقلابی اور ترقی پسند جماعت اپنا جیکارہ بنا سکتی ہے۔ یا جب وہ دانایانِ فرنگ کو للکارتے ہیں :-

کوہکن تیشہ بدست آمد و پرویزی خواست
عشرتِ خواجگی و محنتِ لالائی رفت
یوسفے را ز اسیری بہ عزیزی بردند
ہمہ افسانہ و افسونِ زلیخائی رفت
چشم بکشائے اگر چشمِ تو صاحب نظر است
زندگی در پئے تعمیرِ جہانے دگر است

تو کون ہے جو ان کو ترقی کا مبلغ ماننے سے انکار کر دے۔ لیکن پھر اقبال کے پیغام کا ایک خاصا حصہ ایسا بھی ہے جو قدامت پرستی اور رجعت کی بھی تعلیم دیتا ہے۔

۸

اقبال کا وہ میلان جو حجازیت کے نام سے مشہور ہے ان کی اسی ماضی پرستی اور رجعت پسندی کا نتیجہ ہے۔ اس بات پر جس قدر حیرت کی جائے کم ہے کہ جس شخص کی یہ تخئیل رہی ہو :-

نہ چینی و عربی و نہ رومی و شامی سما سکا نہ دو عالم میں مردِ آفاقی

جو شاعر ہمیں اس طرح للکار سکے :-

جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا
ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابیِ والا گہر

وہ پھر اس بات پر کیسے ناز کر سکتا ہے کہ

"نغمہ ہندی ہے مرا لے تو حجازی ہے مری"

اقبال کے فکر و شعور میں یہ نیا موڑ ولایت پہنچکر پیدا ہوا۔ تبدیلِ میلان کے اسباب پہلے سے اکٹھا تھے ہندوستان کی حالت ابتر تھی اور دوسرے ایشیائی ممالک بھی کچھ بہتر حالت میں نہ تھے خاص کر اسلامی ممالک کا سفینہ تباہی کے طوفان میں پڑا ہوا بری طرح تھپیڑے کھا رہا تھا۔ ایران دم توڑ رہا تھا۔ عرب میں مناقشے پیدا ہو رہے تھے۔ اور ذی اقتدار قوموں کے دانت اس پر گڑے ہوئے تھے۔ "مشرق کا مرد بیمار" (ٹرکی) صحیح اور توانا مردوں کی آنکھوں میں کھٹک رہا تھا اور وہ اس کی پرانی بیماری سے فائدہ اٹھانے کی تدبیریں سوچ رہے تھے۔ یہ حالات اقبال کے دل و دماغ پر ولایت جانے سے پہلے اپنا اثر ڈال چکے تھے ولایت پہنچ کر اقبال کے تاثرات زیادہ شدید اور راسخ ہو گئے۔ اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ وہ قوم پرستی اور حب وطن جس کی بنیاد جغرافیائی تقسیم اور ملکی تنظیم پر ہو دنیا ہمیشہ فساد اور بدنظمی۔ جدال و قتال، جنگ اور غارتگری کا سبب

بن کے رہے گی اور اس کو انسانیت کی کوئی بلند تخیل کسی حالت میں بھی نہیں بنایا جا سکتا۔ اس خیال نے ان کو دنیا کی جدید ترین تحریک یعنی آفاقیت کی طرف مائل کر دیا۔ وہ آفاقیت جو انسانیت کا دوسرا نام ہے۔ اب وہ قومیت اور وطنیت دونوں سے بیزار تھے۔ اور اپنے کو ہندوستان یا کسی ملک یا کسی قوم سے وابستہ رکھنا نہیں چاہتے تھے بلکہ سارے جہان کو اپنا وطن تصور کرنے لگے تھے۔ ان کی تعلیم اب یہ تھی:-

پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا
تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا

یہ انسانیت کی بہت بلند تخیل ہے لیکن اس کا نام لے کر بہک جانے کے بھی بہت سے امکانات ہیں۔ اقبال اپنی تخیل کو سیدھے راستے پر قائم نہ رکھ سکے۔ اور ان کی آفاقیت میں بہت سے غلط تصورات داخل ہو گئے۔ سب سے پہلی جو قابلِ غور ہے، یہ ہے۔ کہ اقبال کی ماورائیت جو تصوف کی قسم کا ایک فلسفہ ہے یہاں بھی یہاں بھی دخل انداز ہونے لگی اور ان کی آفاقیت اور لا وطنیت کچھ لامکانیت ہو کر رہ گئی۔ اگر تامل کے ساتھ اقبال کے کلام کا مطالعہ کیا جائے اور ان کے کلام سے جو اثرات مترتب ہوتے ہیں ان کا تجربہ کیا جائے تو ہم کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کے دل میں ہماری دنیائے آب و گل کے لئے نہ کوئی محبت تھی اور نہ کوئی جذبہ احترام۔ یہ

سچ ہے کہ تمام بنی نوع انسان کو ایک نظامِ اخوت کے ماتحت لے آنا اور ساری دنیا کو ایک اجتماعی ہیئت کا پابند بنانا انسان کا بہترین کارنامہ ہوگا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہ ہونا چاہییں کہ جس مٹی سے ہمارا خمیر ہوا ہو اس کے لئے ہمارے دل میں کوئی اُنس یا درد باقی نہ رہے اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اقبال کا کلام اس درد اور اُنس سے خالی ہے۔ ان کو ہمارے کرۂ ارضی سے زیادہ خورشید و ماہ، انجم و کہکشاں کی دنیا سے محبت معلوم ہوتی ہے۔ اور وہ اپنے خیال میں ستاروں سے آگے کی آبادیوں میں کھوئے رہتے ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اقبال کا یہ خیال غلط ہے کہ

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

مگر اس دنیا کے امتحانات میں پورا اترنے سے پہلے ماورائے انجم و ماہ میں پہنچ جانا ایک قسم کی فراریت (ESCAPISM) ہے جو اقبال جیسے فکر و عمل کے شاعر کے لئے زیبا نہیں۔

اس کے علاوہ اقبال کی آفاقیت اور لاوطنیت نے ایک دوسرا ناگوار عنوان اختیار کر لیا۔ یعنی وہ قوم پرستی اور وطنیت کے تنگ دائرے سے نکل کر مذہب و ملت کے تنگ دائرہ میں پھنس گئے۔ اقبال اس کو محسوس نہ کر سکے یا اگر محسوس کیا تو تجاہل برت گئے۔ کہ آفاقیت میں اگر ملکی اور نسلی امتیازات کی گنجائش نہیں ہے تو اسلام اور غیر اسلام

کے فرق اور مسلم غیر مسلم کی شناخت کی بھی اس میں کھپت نہیں ہے۔

اقبال کی حمایت میں کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے جن امتیازات کو تسلیم کیا ہے اور قائم رکھنا چاہا ہے وہ نہ ملکی ہیں اور نہ نسلی اور نہ طبقاتی بلکہ فکریاتی (IDEOLOGICAL) یعنی انہوں نے تخیلات اور تصورات کی بنا پر مسلم اور غیر مسلم کے درمیان امتیاز کرنا چاہا ہے۔ یہ صحیح ہے اور یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ اقبال نے اسلام کے تصور کو از سر نو پیدا کیا ہے اور اس کو پہلے سے کہیں زیادہ جاندار حقیقت بنانے کی کوشش کی ہے۔ ان کا "مرد مومن" کوئی مسجد کا امام یا مدرسہ کا ملا یا خانقاہ کا پیر نہیں ہے بلکہ اس کی تخئیل بہت بلند اور بے انتہا وسیع ہے۔ اور اس میں وہ تمام فضائل موجود ہیں جو اعلیٰ سے اعلیٰ انسان میں پائے جا سکتے ہیں مثلاً "مردِ مومن" کی پہچان اقبال یہ بتاتے ہیں:۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

ظاہر ہے کہ ایسے مردِ مومن کے ساتھ کسی کو کوئی پرخاش یا کینہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن پھر اس کو نہ بھولیے کہ یہ ایک ایسی پہچان ہے جو ہر جری اور حق پرست انسان میں پائی جا سکتی ہے چاہے وہ مومن ہو یا غیر مومن اقبال کو خواہ مخواہ اصرار ہے کہ یہ مومن ہی کی علامت ہو سکتی ہے اور جس کسی میں یہ علامت پائی جائے اس کو مومن ہی سمجھیے۔ یہ ایک ایسی ضد ہے جو اقبال کے شعور و فکر میں ایک نفسیاتی گرہ (PRYCHOLOGICAL COMPLEX)

ہو کر رہ گئی ہے۔

اقبال کی حجازیت کی تاویل میں یہ بھی کہا سکتا ہے کہ تخیل اور واقعہ میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ آفاقیت ایک تخیل ہے جس کو اب تک عملی زندگی میں خاطر خواہ برتا نہیں جا سکا ہے۔ دنیا کی سب سے زبردست آفاقی تحریک یعنی اشتراکیت کو بھی خارجی حالات اور مزاحم سے مجبور ہو کر جغرافیائی حدود کے اندر رہ جانا پڑا۔ پھر اگر ایک فردِ واحد نے باہری رکاوٹوں اور کشاکشوں سے عاجز اور سراسیمہ ہو کر اپنے انسانیت اور آفاقیت کے پیغام کو ایک محدود جماعت کے لئے وقف کر دیا تو ہم کو اس سے محاسبہ کرنے کا کچھ زیادہ حق حاصل نہیں۔

یہ اور اسی قسم کی بہت سی باتیں اقبال کی حمایت میں کہی جا سکتی ہیں۔ اور کہی جاتی ہیں۔ لیکن یہ سب محض اعتذار (APOLOGY) ہے جس کو بے لاگ تنقید سے کوئی واسطہ نہیں۔ اقبال پر ہمارا الزام جہاں کا تہاں رہ جاتا ہے۔ وہ اپنی تخیل کی تاب نہ لا سکے اور بہت جلد اس سے منہ موڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس سے ان کی شاعرانہ اور مفکرانہ حیثیت کو جو یقیناً آفاقی تھی بڑا خسارہ ہوا۔

آخری دور میں اقبال کی شاعری میں ایک اور میلان پیدا ہو گیا جو حجازیت سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ اور جس کو ہم عقابیت کہیں گے اور جو ایک قسم کی فاشیت (FASCISM) ہے۔ جس طرح اقبال کے تصور میں حجاز نے اپنا تسلط جما لیا تھا اسی طرح عقاب، شاہین، شہباز اور

چیتے جیسے سفاک جانوروں نے بھی ان کی فکر و بصیرت میں ایک مرکزی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ وہ انسان میں بھی بالخصوص "مردِ مومن" میں انھیں پھاڑ کھانے والے جانوروں کی خصلت دیکھنا چاہتے ہیں سنئے کتنی لذت لے کر کہتے ہیں :-

جو کبوتر پہ جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

ذرا ہم آپ تھوڑی دیر کے لئے سوچیں کہ اگر یہ غارتگرانہ میلان عام ہو جائے اور زبردستوں کو زیردستوں پر یوں ہی جھپٹنے کا معاشرتی اور قانونی حق دیا جائے تو ہماری دنیا کا کیا حال ہوگا۔ اور وہ رہنے کے لئے کیسی جگہ ہوگی ؟

اقبال نے یہ بھی نہ سوچا کہ اگر تہذیبِ انسانی کی آخری تخئیل یہی ہوتی تو اس کو ہلاکو اور چنگیز کے دور سے آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے علاوہ اگر اقبال واقعی اس عقابیت کو انسانیت کا سب سے بڑا اکتساب تصور کرتے تھے تو پھر انہوں نے حبشہ کے حال پر ایسی دردمندی کے آنسو کیوں بہائے۔ مسولینی نے تو وہی کیا تھا۔ جو اقبال کا شاہین اپنے بچے کو تعلیم دے چکا ہے۔ اور جس کو خود اقبال دنیائے انسانیت کا بہترین دستور العمل خیال کرتے ہیں۔

یہ ہیں وہ غلط راہیں جن پر اقبال اپنے رجعتی میلان کی بدولت جا پڑے۔ رہ رہ کر یہ احساس ہمارے دلوں میں ٹیسیاں لیتا ہے کہ اقبال اپنے تمام نئے اور ترقی پسند افکار اور تاملات

کے باوجود چھوڑی ہوئی منزلوں پر پہنچ جاتے ہیں اور کچھ تھک کر اور کچھ پریشان و ہراساں ہو کر انھیں منزلوں سے ترقی اور انقلاب کی صدائیں بلند کرنے لگتے ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے:۔

تھی کسی درماندہ رہرو کی صدائے دردناک
جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں

کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آواز اقبال کے دل سے اٹھی تھی، اس لئے کہ اس کے لہجہ میں جو پُرخلوص حسرتناکی ہے وہ محض تخیل سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ بعض اوقات ہم کو اقبال کی ساری شاعری رجعت نہ سہی تو درماندگی تو معلوم ہی ہونے لگتی ہے۔

لیکن اقبال کی حمایت اور مخالفت میں سب کچھ کہہ چکنے کے بعد بھی ان کی شاعرانہ عظمت اور مفکرانہ منزلت کا دل سے قائل ہونا پڑتا ہے۔ ان کے کلام کا ایک معتدبہ حصہ ایسا ہے جو ان تمام کوتاہیوں اور غلط اندیشیوں سے پاک ہے۔ اور جو یقیناً انسانیت کا پیغام ہونے کے اعتبار سے ایک آفاقی مرتبہ رکھتا ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اقبال کی شاعری سے فائدہ اٹھائیں اور اس سے نئی اور ترقی پذیر زندگی کی تعمیر میں کام لیں تو ہم کو ان کے تمام غلط میلانات اور بے راہیوں سے بچا کر بڑھنا پڑے گا اور صرف ان عناصر کو اخذ کرنا ہوگا جو عام انسانی زندگی کی تہذیب و ترقی کے لئے مفید اور صحت بخش ثابت ہو سکتے ہیں۔ اور یہی عناصر اقبال کو زندہ رکھیں گے

خود اقبال کو اپنی حجازیت اور عقابیت پر جس قدر بھی ناز رہا ہو

اوران تصورات سے ایک کم تعداد اور محدود جماعت کو جس قدر بھی وقتی اور عارضی فائدہ پہنچا ہو لیکن اگر ہم سوچیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ ان کی شاعری کا اصل جوہر نہ حجازیت ہے نہ عقابیت بلکہ وہ انسانیت ہے جو ہر زمانے میں قابلِ تسلیم چیز سمجھی جائے گی۔ آئندہ نسلیں اقبال کی جس چیز کو اپنے لیے باعث خیر و برکت تصور کریں گی وہ نہ ان کا ہندی نغمہ ہوگا نہ حجازی لَے بلکہ انسانیت اور آفاقیت کی دھن کے وہ ارتعاشات ہوں گے جن سے ان کی ساری شاعری گونج رہی ہے اور جن کی انسانی تہذیب کو اپنی بقا اور ترقی کے لیے ہمیشہ ضرورت ہوگی۔ اقبال کے جو اشعار بعید سے بعید مستقبل میں بھی بصیرت افروز پائے جائیں گے وہ (اس سے بحث نہیں کہ "شمع و شاعر" سے ماخوذ ہوں یا "خضر راہ" سے یا کسی اور نظم یا غزل سے) وہی اشعار ہوں گے جن کی روح رواں وہ انسانی احساس ہے جو اقبال کی فطرت کی ایک نمایاں اور ممتاز خصوصیت ہے اور جو ان کے تمام تناقضات اور اندرونی پیکار کے باوجود ان کی ساری ہستی پر رہ رہ کر حاوی ہو جاتا ہے۔ اور ان کو ایسے اشعار کہنے پر مجبور کرتا ہے جن میں کہیں کھلے الفاظ میں اور کہیں بلیغ اور موثر اشاروں میں کائناتی اور انسانی زندگی کے متعلق مستقل اور ہمہ گیر حقیقتوں کا اظہار کیا گیا ہے اور جو تہذیب و تمدن کے ہر دور میں بصیرت افروز ثابت ہوں گے۔

کچھ اشعار نمونے کے طور پر منتخب کئے جاتے ہیں۔

یہی آئینِ قدرت ہے یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل پر گامزن محبوبِ فطرت ہے

خموشی اے دلِ بھری محفل میں چلّانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

رازِ حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے

ریاضِ ہستی کے ذرّہ ذرّہ سے ہے محبت کا جلوہ پیدا
حقیقتِ گل کو تو جو سمجھے تو یہ بھی سیماں ہے رنگ و بو کا

گذر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہان میخانہ ہر کوئی بادہ خوار ہوگا

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

الٰہی پھر مزا کیا ہے یہاں دنیا میں جینے کا
حیاتِ جاوداں میری نہ مرگِ ناگہاں میری

تو ابھی رہگذر میں ہے قیدِ مقام سے گذر
مصر و حجاز سے گذر پارس و شام سے گذر

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

کنشت و مسجد و بت خانہ و دیر
جز ایں مشتِ گلے پیدا نہ کردی
ز حکمِ غیر نتواں جز بہ دل زیست
تو اے غافل دلے پیدا نہ کردی

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش
براہِ دیگراں رفتن عذاب است
گر از دستِ تو کارے نادر آید
گناہے ہم اگر باشد ثواب است

دریں گلشن پریشاں مثلِ بوئیم
نمی دانم چہ می خواہم چہ جوئیم
برآید آرزو یا بر نیاید
شہیدِ سوز و سازِ جستجوئیم

تنے پیدا کن از مشتِ غبارے
تنے محکم تر از سنگیں حصارے
درونِ او دلِ درد آشنائے
چو جوئے در کنارے کوہسارے

مشو اے غنچۂ نورستہ دلگیر
ازیں بستاں سرا دیگر چہ خواہی
لبِ جو بزمِ گل مرغِ چمن سیر
صبا شبنم نوائے، صبحگاہی

جہانِ ما کہ جز انگارۂ نیست
اسیرِ انقلابِ صبح و شام است
ز سوہانِ قضا ہموار گردد
ہنوز ایں پیکرِ گل ناتمام است

نہ بہ امروز اسیرم نہ بفردا نہ بہ دوش
نہ نشیبے نہ فرازے نہ مقامے دارم

میبارا بزم بر ساحل کہ آنجا
نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش درآویز
حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

بہ پائے خود مزن زنجیرِ تقدیر
تہِ ایں گنبدِ گرداں رہے ہست
اگر باور نداری خیز و دریاب
کہ چوں پا واکنی جولانگہے ہست

ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے
سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے

بہ آشیاں نہ نشینم ز لذتِ پرواز
گہے بہ شاخِ گل و گاہ بر لبِ جویم

یا زخلوتکدۂ غنچہ بروں زن چو شمیم
یا نسیم سحر آمیز و وزیدن آموز
آفریدند اگر شبنم بے مایہ ترا
خیز و بر داغِ دل لالہ چکیدن آموز

خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

پرانے ہیں یہ ستارے فلک بھی فرسودہ
جہاں وہ چاہیے مجھ کو جو ہو ابھی نو خیز

تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں
ناداں جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

مردِ درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ
ہے کسی اور کی خاطر یہ نصابِ زر و سیم

عروجِ آدمِ خاکی کے منتظر ہیں تمام
یہ کہکشاں یہ ستارے یہ نیلگوں افلاک

میری میں فقیری میں شاہی میں غلامی میں
کچھ کام نہیں بنتا بے جرأتِ رندانہ

اب کیا جو فغاں میری پہنچی ہے ستارہ تک
تو نے ہی سکھائی تھی مجھ کو یہ غزلخوانی

درویشِ خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

کوہ شگاف تیری ضرب تجھ سے کشادہ شرق و غرب
تیغِ ہلال کی طرح عیشِ نیام سے گذر

طبیبِ عشق نے دیکھا مجھے تو فرمایا
ترا مرض ہے فقط آرزو کی بے تابی
وہ شے کچھ اور ہے کہتے ہیں جانِ پاک جسے
یہ رنگ و نم یہ لہو آب و ناں کی ہے بیتابی

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

نگہ بلند سخن دلنواز جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

نومید نہ ہو ان سے اے رہبرِ فرزانہ
کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

خزاں میں بھی کب آسکتا تھا میں صیاد کی زد میں
مری غماز تھی شاخِ نشیمن کی کم اوراقی

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد
نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو
یہ دل کی موت وہ اندیشہ و نظر کا فساد

کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحبِ ہوش
اک جہاں اور بھی ہے جس میں نہ فردا ہے نہ دوش
صاحبِ ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے
گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش

غنچۂ دل گرفتہ را از نفسم گرہ کشائے
تازہ کن از نسیمِ من داغِ درونِ لالہ را

بہ ضمیرم آنچناں کن کہ ز شعلۂ نوائے
دلِ خاکیاں فروزم دلِ نوریاں گدازم
تب و تابِ فطرتِ ما ز نیازمندیٔ ما
تو خدائے بے نیازی نرسی بسوز و سازم

ندارد عشق سامانے و لیکن تیشۂ دارد
خراشد سینۂ کہسار و پاک از خونِ پرویز است

نہ کشد سفینۂ کس بہ یمِ بلند موجے
خطرے کہ عشق بیند بسلامتِ کنارہ

گرچہ صد گونہ بصد سوز مرا سوختہ اند
اے خوشا لذتِ آں سوز کہ ہم سازے ہست

عقل ہم عشق است واز ذوقِ جنوں بیگانہ نیست
لیکن آں بیچارہ را آں جرأتِ رندانہ نیست
با چنیں زورِ جنوں پاسِ گریباں داشتم
در جنوں از خود نہ رفتن کارِ ہر دیوانہ نیست

می تواں ریخت در آغوشِ خزاں لالہ و گل
خیز و بر شاخِ کہن خونِ رگِ تاک انداز

ہوائے خانہ و منزل ندارم
سرِ راہم غریبِ ہر دیارم

بر دلِ آدم زدی عشقِ بلا انگیز را
آتشِ خود را بہ آغوشِ نیستانے نگر

وگر دیوانہ آید کہ در شہر افگند ہوئے
دو صد ہنگامہ برخیزد ز سودائے کہ من دارم

برخیز کہ آدم را ہنگامِ نمود آمد
این مشتِ غبارے را انجم بہ سجود آمد
آں راز کہ پوشیدہ در سینۂ ہستی بود
از شوخیٔ آب و گلِ در گفت و شنود آمد

تو از ستمارِ نفس زندۂ می دانی
کہ زندگی بہ شکستِ طلسمِ ایام است

اے کہ آسودہ نشینی لبِ ساحل برخیز
کہ ترا کار بہ گرداب و نہنگ است ہنوز
از سرِ تیشہ گذشتن ز خردمندی نیست
اے بسا لعل کہ اندرونِ سنگ است ہنوز

چوں جہاں کہنہ شود پاک بسوزند او را
وز ہماں آب و گل ایجادِ جہاں نیز کنند
تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ
عشق کارے است کہ بے آہ و فغاں نیز کنند

چو موج مستِ خودی باش و سر بطوفاں کش
ترا کہ گفت کہ بنشین و پا بداماں کش

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

گفتند جہانِ ما آیا بہ تو می سازد
گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

تو چشم بستی و گفتی کہ ایں جہاں خواب است
کشائے چشم کہ ایں خواب خوابِ بیدار است

دریں چمن کدہ ہر کس نشیمنے سازد
کسے کہ سازد و واسوزد آشیانہ کجا است

باز بر رفتہ و آئندہ نظر باید کرد
ہلہ برخیز کہ اندیشہ دگر باید کرد
عشق بر ناقۂ ایام کشد محملِ خویش
عاشقی ؟ راحلہ از شام و سحر باید کرد

گماں مبر کہ ہمیں خاکداں نشیمنِ ما است
کہ ہر ستارہ جہان است یا جہاں بودہ است

سنگ می باش و دریں کارگہ شیشہ گذر
وائے سنگے کہ صنم گشت و بہ بینا نہ رسید

عاشق آن است کہ تعمیر کند عالم خویش
ورنہ سازد بجہانے کہ کرانے دارد

دریں چمن دل مرغاں زماں زماں دگر است
بہ شاخِ گل دگر است و بہ آشیاں دگر است
بہر زمانہ اگر چشمِ تو نکو نگرد
طریقِ میکدہ و شیوۂ مغاں دگر است

ذرۂ بے مایۂ ترسم کہ ناپیدا شوی
پختہ تر کن خویش را تا آفتاب آید بروں

بہر نفس کہ بر آری جہاں دگر گوں کن
دریں رباطِ کہن صورت زمانہ گزر

کسے ایں معنیٔ نازک نداند جز ایازے ایں جا
کہ ہر غزنوی افزوں کند وردِ ایازی را

اے کہ نوشم خوردۂ از تیزیٔ نیشم مرنج
نیش ہم باید کہ آدم را رگِ خوابے دہد

فروغِ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے
زمیں از کوکبِ تقدیرِ ما گردوں شود روزے

سخن زنامۂ و میزاں دراز تر گفتی
بہ حیرتم کہ نہ بینی زمانۂ موجود

فروغِ آدمِ خاکی ز تازہ کاریہا است
مہ و ستارہ کنند آنچہ پیش ازیں کردند

باز ایں عالمِ دیرینہ جواں می بائست
برگِ کاہش صفتِ کوہِ گراں می بائست
ایں مہ و مہرِ کہن راہ بجائے نہ برند
انجمِ تازہ بہ تعمیرِ جہاں می بائست
ہر نگارے کہ مرا پیشِ نظر می آید
خوش نگارے است ولے خوشتر ازاں می بائست
گفت یزداں کہ چنیں است دگر ہیچ مگو
گفت آدم کہ چنیں است و چناں می بائست

(۹)

اقبال کے فلسفیانہ میلانات اور ان کے پیغام میں ہم کچھ اس طرح محو ہو جاتے ہیں کہ ان کی ایک حیثیت کو جو سب سے زیادہ مستقل اور ممتاز ہے بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ اقبال کی پہلی اور آخری حیثیت شاعر کی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہمارے ادب اور ہماری معاشرت کی تاریخ میں اقبال کا شمار اُن دانایانِ راز میں ہوگا جو مستقبل کی جھلک دکھا کر فکر و عمل کا رُخ نئی سمتوں میں موڑ سکتے ہیں۔ اس سے تو کبھی بھی کسی کو انکار نہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ یہی ان کی ساری شخصیت اور ساری حیثیت ہے۔ آیئے ہم تھوڑی دیر کے لئے بھول جائیں کہ اقبال کوئی مفکر یا مبلغ تھے۔ یا ان کا کوئی خاص فلسفۂ حیات یا پیغام تھا اور یہ دیکھیں کہ خالص شاعر کی حیثیت سے اُن کا کیا مرتبہ ہے اگر ہم ان کے فلسفہ اور پیغام کو نظر انداز کر دیں یا کسی ایسے زمانہ کا تصور کر سکیں جب کہ ان کے افکار و میلانات کا کوئی عنصر بھی زندہ نہ رہے گا تو اس حالت میں بھی ہم کو یہ ماننا پڑے گا کہ محض صنّاع اور شاعر کی حیثیت سے اقبال دنیا کے بڑے بڑے شاعروں کے ساتھ جگہ پا سکتے ہیں۔ افکار و جذبات سے برطرف ہو کر اقبال نے اردو شاعری میں جو نئے اسالیب و صور تراشے ہیں اور پرانے اسالیب کو نئے انداز سے استعمال

کر کے جو نئے آہنگ پیدا کئے ہیں وہ ہماری شاعری کی زبان میں یقیناً اختراعات کا حکم رکھتے ہیں۔ اور مستقل اضافے ہیں۔

شاعر کے لغوی معنی ایک ایسے صاحبِ شعور کے ہیں جو دوسروں میں بھی شعور پیدا کر سکتا ہو۔ اگر ہم شاعر کی صرف اس قدر تعریف مان لیں تو اقبال کے متعلق کبھی دو رائیں نہیں ہو سکتیں جو کچھ اس سے پہلے کہا جا چکا ہے وہ اقبال کو صاحبِ شعور اور شعور آفریں ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ انہوں نے دنیا کو نئی آگاہیاں دیں۔ ان کو زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں کا احساس پیدا ہوا اور انہوں نے دوسروں میں بھی اس کا شدید احساس پیدا کیا۔ لیکن بعض نقادوں کے خیال میں شاعر کی تعریف صرف اس قدر نہیں ہے اس جماعت کا خیال ہے کہ شاعری میں صرف یہ دیکھنا نہیں چاہیے کہ کیا کہا گیا ہے بلکہ یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ کس عنوان اور کس انداز سے کہا گیا ہے۔ یعنی شاعری کے ترکیبی عناصر دو ہیں۔ معنی اور صورت۔ معنی کے نقطۂ نظر سے تو ہم کو اب اقبال کے متعلق کچھ اور کہنا نہیں۔ اب یہ دیکھنا چاہیے کہ صوری اعتبار سے اقبال کی شاعری کیا درجہ رکھتی ہے۔

اقبال کی اس حیثیت پر نظر ڈالتے وقت ہم کو یہ بات بھولنا نہ چاہیے کہ ان کی شاعری کی ابتدا جیسا کہ عام طور سے ہوا کرتا ہے غزل سے ہوئی اور اول اول داغ کو انہوں نے اپنا استاد منتخب

کیا۔ بظاہر یہ کوئی بڑی اہم بات معلوم نہیں ہوتی۔ اور اقبال کے اکثر تنقید نگاران کی شاعرانہ زندگی کے اس واقعہ کو اعتنا کے قابل نہ سمجھیں گے۔ لیکن ہماری رائے میں اقبال کی خالص فن کارانہ اہمیت کی بنیاد یہی واقعہ ہے۔ اگر ہم صحیح ذوق کے ساتھ اقبال کے کلام کا مطالعہ کریں تو کیا نظم میں کیا غزل میں جو کیفیت سب سے زیادہ نمایاں اور مؤثر طور پر محسوس ہوتی ہے وہ وہی ہے جس کو مبہم اور مجموعی طور پر تغزل کہا جا سکتا ہے۔ ہم کو تو کبھی کبھی ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ اقبال فطرتاً غزل گو تھے۔ اور اتنے بڑے نظم نگار ہونے کے بعد اور اس کے باوجود بھی وہ غزل گو ہی رہے۔ نظموں میں بھی انہوں نے ایک قسم کی غزل گوئی ہی کی ہے۔ اس کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ ان نظموں میں شاید گنتی کے اشعار ایسے نکلیں گے جو فرداً فرداً اپنی جگہ معنی اور اسلوب دونوں کے اعتبار سے مکمل نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر اقبال کی نظموں کے بند کے بند بغیر ارادہ اور کوشش کے زبان پر چڑھ جاتے ہیں اور ہر شعر اپنے اندر ضرب المثل ہو جانے کی قوی صلاحیت رکھتا ہے۔

اچھی شاعری کی ایک زبردست اور لازمی علامت ترنم اور موسیقیت ہے۔ موسیقیت سے شاعری کا خمیر ہوا۔ ہر چھوٹے بڑے شاعر کے کلام میں کسی نہ کسی قسم کی موسیقیت ضرور پائی جاتی ہے۔ ورنہ شعر اور نثر کے اثرات برابر ہوں۔ میرؔ سے لے کر داغؔ تک اور داغؔ سے لے کر اب تک ہر شاعر کے ہاں موسیقیت ملے گی۔ اور ہر شاعر کی موسیقیت کا انداز

جدا ہوگا۔ اقبال کی شاعری کا بھی ایک غالب عنصر اس کی انفرادی موسیقیت ہے۔ جس کی سب سے نمایاں خصوصیت ہمواری اور بلاغت ہے۔ اس اعتبار سے اردو کا کوئی دوسرا شاعر ان کا پورا حریف نظر نہیں آتا۔ اگر دماغ ہمواری میں ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں تو بلاغت اور معنوی قدر کا ان کے یہاں پتہ نہیں ہے۔ اور اگر غالب بلاغت میں اقبال کے ہمسر کہے جا سکتے ہیں تو ان کے کلام کی موسیقیت میں ایسی ہمواری نہ ملے گی۔

اقبال کے اشعار ہماری سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں یا ان کے افکار و نظریات سے ہم کو اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن جس خصوصیت کا ان کے حامی اور مخالف دونوں کو قائل ہونا پڑے گا وہ یہ ہے کہ ان کا ایک مصرعہ ایسا نہیں ہوتا جو نازک سے نازک ساز پر گایا نہ جا سکتا ہو۔ اور یہ خصوصیت محض غنائی نہیں ہے یعنی وہ محض خوش آہنگ الفاظ کے حسنِ ترتیب سے نہیں پیدا ہوئی ہے۔ اقبال کے اشعار میں جو موسیقیت ہوتی ہے وہ ایک مرکب آہنگ ہے جس کو الفاظ و افکار دونوں سے بہ یک وقت ایک اصلی اور اندرونی تعلق ہوتا ہے۔ اور ہم کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ الفاظ اور معنی باہم مل کر ایک ایسی دھن پیدا کر رہے ہیں جس کا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لئے اقبال کا ترنم کبھی سطحی نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے اندر تہ بہ تہ گہرائیاں ہوتی ہیں۔

جہاں تک الفاظ اور ترکیبوں کے حسنِ انتخاب کا تعلق ہے اقبال ہم کو جدید شعرائے اردو میں سب سے زیادہ ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان کا

اسلوب بحیثیت مجموعی وہی ہے جس کو غزل کا روایتی اسلوب کہہ سکتے ہیں اور جس کا جوہر رومانیت ہے. لیکن اقبال کا اصل اجتہاد یہ ہے کہ انہوں نے پرانے الفاظ اور فقرات اور پرانے اسالیب و روایات کو بالکل نئے انداز سے استعمال کر کے ہماری زندگی کی نئی ضرورتوں کیلئے کام میں لائے ہیں، چنانچہ اگر ٹھہر کر غور کے ساتھ ان کے اسلوب پر نظر ڈالی جائے تو اقبال کا اسلوب ہمارے اندر ایک ہی وقت میں قدامت اور جدت، پختگی اور تازگی دونوں کا ایک مرکب احساس پیدا کرتا ہے. یہ بڑا مشکل کام تھا اور اس کو اقبال کا معمولی اکتساب کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا.

ایک گروہ ہے جو اقبال پر اعتراض کرتا ہے کہ ان کے وہاں فارسی الفاظ و ترکیبوں اور ایران و عرب کی تواریخی زندگی سے متعلق روایات و تلمیحات اور انھیں سے ماخوذ تشبیہات و استعارات کی بھرمار ہے. یہ شکایت ایک خاص نقطۂ نظر سے اور ایک حد تک بجا ہے. اقبال کی بڑھی ہوئی فارسیت نے ان کو عوام کا شاعر ہونے نہیں دیا، اور اس لحاظ سے وہ یقیناً خسارے میں رہے. مگر پھر ایسا مفکر اور صاحب شعور شاعر عوام کی اور پھر ہندوستان کے عوام کی چیز نہیں ہو سکتا. اقبال کی فارسیت سے ان کو صرف اس قدر نقصان پہنچا ہے کہ ان کے سمجھنے والوں اور ان کے پیغام سے موافق یا مخالف اثر قبول کرنے والوں کا دائرہ محدود ہو گیا. لیکن اس سے ان کی شاعری کو فائدہ بھی بہت پہنچا. ان کے کلام میں ایک حلاوت. ایک متنوع ترنم. ایک بلیغ خوش آہنگی بھی پیدا ہو گئی ہے جو داغ

یا امیر کی سلیس اور عام فہم اور رواں اور سہل زبان کے استعمال سے نہیں پیدا ہو سکتی تھی۔ اقبال کی شاعری میں جو صوتی حسن ہے اس کی ترکیب میں جہاں اور بہت سے عناصر داخل ہیں وہاں ایک عنصر فارسی الفاظ کا صحیح اور کامیاب انتخاب اور ان کا قرینہ کے ساتھ استعمال بھی ہے۔

اقبال کی فطرت کو موسیقی کے ساتھ پیدائشی لگاؤ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اشعار گنگنا کر نہیں بلکہ باقاعدہ گا کر کہا کرتے تھے۔ یہ ایک زبردست اشارہ ہے جس سے ہم ان کے مزاج شعری کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اقبال جیسا مفکر اور پیغامبر نظم لکھنے والا ایسا کامیاب اور اثر انگیز غزل گو بھی رہ سکا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جیسا کہ اشارتاً کہا جا چکا ہے ان کی اصلی فطرت تغزل اور ان کا اصلی فن غزل تھا۔ ان کا ایک شعر ہے جس سے ان کے اصلی اور ایک حد تک دبے ہوئے میلان کا پتہ چلتا ہے۔

میری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی
شیخ کہتا ہے کہ ہے وہ بھی حرام اے ساقی

اقبال کی غزلیات و نظمیات کا شروع سے آخر تک سلسلہ اور ترتیب کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو موسیقیت اور خوش آہنگی کی خصوصیت ان کے ہاں برابر ملے گی۔ البتہ مختلف دور میں اس موسیقیت کی گہرائی اور معنویت میں فرق ہوگا۔ ابتدائی دور میں اقبال کی شاعری میں جو صوتی حسن ہے وہ زیادہ تر بالائی ہے۔ اور اس کا حجم کم ہے۔ رفتہ رفتہ اور درجہ بدرجہ اقبال کی موسیقیت میں گہرائی اور اندرونی کیفیت

بڑھتی گئی۔ اور روز بروز ان کے افکار کی طرح زیادہ بلیغ اور مستقل ہوتی گئی۔

اب آیئے اس نقطۂ نظر سے اقبال کے کچھ اشعار پر نظر ڈالی جائے بلا لحاظ اس کے کہ وہ غزل کے ہیں یا نظم کے۔ جو اشعار اس سے پہلے مختلف موقعوں پر منتخب کئے جا چکے ہیں ہمارے دعویٰ کی تائید کے لئے کافی ہیں مگر اب کچھ اور اشعار پیش کئے جاتے ہیں جن سے ہم اپنے اس دعویٰ کو ثابت کر سکتے ہیں کہ اقبال ایک خالص فن کار کی حیثیت سے بھی اپنا ایک شخصی مقام رکھتے ہیں اور ان کی شاعری محض جمالیاتی محاسن کی بنا پر بھی گراں قدر اور بلند مرتبہ ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہے۔

در جہاں مثلِ چراغِ لالۂ صحرا ستم
نے نصیبِ محفلے نے شمتِ کاشانہ

تھا جنھیں ذوقِ تماشا وہ تو رخصت ہو گئے
لے کے اب تو وعدۂ دیدارِ عام آیا تو کیا
آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبحدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

آج ہیں خاموش وہ دشتِ جنوں پرور جہاں
رقص میں لیلیٰ رہی لیلیٰ کے دیوانے رہے

خیر تو ساقی سہی لیکن پلائے گا کسے
اب نہ وہ میکش رہے باقی نہ میخانے رہے
رو رہی ہے آج اک ٹوٹی ہوئی مینا اسے
کل تلک گردش میں جس ساقی کے پیمانے رہے

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا نہ طریقہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاک جادوئے سامری تو قتیلِ شیوۂ آذری
میں نوائے سوختہ در گلو تو پریدہ رنگ رمیدہ بو
میں حکایت غمِ آرزو تو حدیثِ ماتمِ دلبری

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کونسی بستی کے یارب رہنے والے ہیں
نہ پوچھو مجھ سے لذت خانماں برباد رہنے کی
نشیمن سیکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں

مجھے روکے گا تو اے ناخدا کیا غرق ہونے سے
کہ جن کو ڈوبنا ہے ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں
محبت کے لیے دل ڈھونڈھ کوئی ٹوٹنے والا
یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی
بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اس گلستاں میں نہیں حد سے گزرنا اچھا
ناز بھی کر تو بہ اندازۂ رعنائی کر

اٹھائے کچھ ورق لالے نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری
اڑائی قمریوں نے طوطیوں نے عندلیبوں نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں

کوئی دل ایسا نظر نہ آیا نہ جس میں خوابیدہ ہو تمنا

الٰہی تیرا جہان گیا ہے نگار خانہ ہے آرزو کا

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

نہیں یہ شانِ خودداری چمن سے توڑ کر مجھ کو
کوئی دستار میں رکھ لے کوئی زیبِ گلو کر لے

تنک بخشی کو استغنا سے پیغامِ خجالت دے
نہ رہ منت کشِ شبنم نگوں جام و سبو کر لے

ہنوز ہم نفسے در چمن نمی بینم
بہار می رسد و من گلِ نخستینم

کس کو معلوم ہے ہنگامہ فردا کا مقام
مسجد و مکتب و میخانہ ہیں مدت سے خموش

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے زار و زبوں

میرِ سپاہ ناسزا لشکریاں شکستہ صف
آہ وہ تیرِ نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف

رہ و رسمِ حرم نامحرمانہ
کلیسا کی ادا سوداگرانہ
تبرک ہے مرا پیراہنِ چاک
نہیں اہلِ جنوں کا یہ زمانہ

پریشاں کاروبارِ آشنائی
پریشاں تر مری رنگیں نوائی
کبھی میں ڈھونڈتا ہوں لذتِ وصل
خوش آتا ہے کبھی سوزِ جدائی

چمن میں رختِ گل شبنم سے تر ہے
سمن ہے سبزہ ہے باد سحر ہے
مگر ہنگامہ ہو سکتا نہیں گرم
یہاں کا لالہ بے سوزِ جگر ہے

تو اے کودک منش خود را ادب کن
مسلماں زادهٔ ترکِ نسب کن
برنگِ احمر و خون و رگ و پوست
عرب نازد اگر ترکِ عرب کن

ربودی دل ز چاکِ سینهٔ من
بغارت بردهٔ گنجینهٔ من
متاعِ آرزویم با کہ دادی!
چہ کردی باغمِ دیرینهٔ من

یمِ عشق کشتیٔ من یمِ عشق ساحلِ من
نہ غمِ سفینه دارم نہ غمِ کرانه دارم

شرار از خاکِ من خیزد کجا ریزم کرا سوزم
غلط کردی که در جانم فگندی سوزِ مشتاقی

گہے رسم و رہِ فرزانگی ذوقِ جنوں بخشد
من از درسِ خردمنداں گریباں چاک می آیم

گہے پیچد جہانِ من گہے من بر جہان پیچم
بگردان بادہ تا بیروں ازیں پیچاک می آیم
نہ ایں جا چشمکِ سامی نہ آں جا حرفِ مشتاقی
ز بزمِ صوفی و ملا گریباں چاک می آیم

مرا براہِ طلب بار در گل است ہنوز
کہ دل بقافلہ ورخت و منزل است ہنوز
کجا است برق نگاہے کہ خانماں سوزد
مرا معاملہ با کشت و حاصل است ہنوز
نگاہِ شوق تسلی نہ جلوہ بخشد
کجا برم خکشے را کہ در دل است ہنوز
حضورِ یار حکایت دراز تر گردید
چنانکہ ایں ہمہ ناگفتہ در دل است ہنوز

تو عیارِ کم عیاراں تو قرارِ بے قراراں
تو دوائے دلفگاراں مگر ایں کہ دیر یابی

من اے دریائے بے پایاں بموجِ تو در افتادم
نہ گوہر آرزو دارم نہ می جویم کرانے را

چو پروین فرو ناید اندیشۂ من
بدریوزۂ پرتوِ مہر و ماہے

درگذر از خاک و خود را پرِ تو خاکی مگیر
چاک اگر در سینہ ریزی آفتاب آید بروں

مثلِ شرر ذرّہ را تن بہ تپیدن دہم
تن بہ تپیدن دہم بال پریدن دہم
یوسف گم گشتہ را باز کشودم نقاب
تا بہ تنک مایگاں ذوقِ خریدن دہم

ہنگامۂ ایں محفل از گردشِ جامِ من
ایں کوکبِ شامِ من ایں ماہِ تمامِ من

یہ اشعار یوں ہی ادھر اُدھر سے چن لئے گئے ہیں اور ان میں کسی ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ طوالت کے خیال سے اتنے ہی اشعار پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔ ورنہ حسنِ صوتی اور خوش

آہنگی کے اعتبار سے اقبال کا کلام کیا اردو کیا فارسی شروع سے آخر تک انتخاب کا حکم رکھتا ہے۔

(۱۰)

اس مختصر سے مقالہ میں اقبال پر جو کچھ کہا گیا ہے وہ کوئی جامع محاکمہ نہیں ہے۔ اقبال کی شاعری پر لکھنے کا حوصلہ مجھے عرصہ سے تھا اور سچ تو یہ ہے کہ یہ حوصلہ ابھی پورا نہیں ہوا ہے اقبال کے متعلق میرے خیالات شروع ہی سے اس قدر باہم متضاد اور مخلوط رہے ہیں کہ ان کو ترتیب دے کر پیش کرنا آسان کام نہیں تھا۔ اقبال مجھے یہ یک وقت بہت بڑے شاعر اور بعض حیثیتوں سے بہت چھوٹے تو نہیں لیکن نہایت کوتاہ نظر اور غلط اندیش شاعر معلوم ہوتے رہے ہیں۔ اور پھر جب کبھی میں نے موازنہ کیا ہے اور شاعر کی توانائیوں اور ناتوانیوں اس کی فکر و نظر کی رسائیوں اور کوتاہیوں کو ایک ترازو پر تولا ہے۔ تو بالآخر مجھے اس کی بڑائی کا پلہ بھاری معلوم ہوا ہے۔

اقبال اپنی کبھی کبھی کی جعت، اسلاف پرستی اور بعض اوقات غلط سمتوں میں مڑ جانے کے باوجود مجھے زندگی انقلاب اور ترقی کے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ زندگی اور

بالیدگی کی، جیسی شدید اور بھرپور لہریں اقبال کی آواز میں محسوس ہوتی ہیں، نہ اُن سے پہلے کسی اردو شاعر کی آواز میں محسوس ہوتی ہیں اور نہ ان کے بعد۔

میں انھیں پیچیدگیوں میں شاید الجھا رہ جاتا اور اقبال پر شاید کبھی کچھ لکھنے کی نوبت نہ آتی۔ لیکن ادھر دو تین سال سے مجھے اپنے طالب علموں کو اقبال پڑھانا پڑتا ہے۔ پڑھانے کے دوران میں اکثر میں کبھی مسلسل اور مربوط اور کبھی اُکھڑے اور غیر مربوط طور پر درجوں میں اقبال پر اپنی رائے لکھوا دیا کرتا تھا۔ اس سال بی۔اے کے پہلے سال کے طلبا کو جو کچھ لکھوایا۔ اُس کی ایک نقل محض اس لئے مانگ لی کہ دیکھوں کیا لکھوا تا رہا ہوں اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ان خیالات کو کچھ پھیلا کر مربوط اور مرتب کر دیا جائے۔ تو اقبال کی شاعری پر ایک مختصر سا تبصرہ ہو سکتا ہے۔ اور میں نے یہی کیا جس کا نتیجہ یہ رسالہ ہے۔

میں نے کوشش کی ہے کہ اقبال کی شاعری اور ان کے پیغام کا کوئی رُخ یا کوئی جزو نظر انداز نہ ہونے پائے۔ لیکن مجھے نہ فرصت اور فراغت میسر تھی، اور نہ ایسے چھوٹے سے رسالہ میں اس کی گنجائش تھی کہ کسی رُخ یا کسی جزو

پر تفصیلی بحث کی جائے۔ اس لئے واضح اور صاف اشاروں میں جہاں تک ہو سکا ہے اقبال کی ہر خصوصیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس میں سے ہر ایک خصوصیت پر ایک مستقل اور جامع کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ یہ کام میں دوسروں کے لئے چھوڑتا ہوں جو قصد و اہتمام کے ساتھ ضخیم کتابیں لکھنے کی زیادہ سکت رکھتے ہوں اور جن کو مجھ سے زیادہ فرصت اور فراغت بھی میسر ہو۔